مثنوی معنوی

بیسویں صدی کے اسلام دشمن حملات کا محکم جواب

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مرحوم

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مرحوم عصر حاضر کی ان نامور شخصیتوں میں سے ایک تھے جن کی علمی و اسلامی خدمات سے فقط برصغیر ہی نہیں بلکہ اسلامی دنیا کے اکثر و بیشتر افراد بخوبی واقف ہیں۔ انہوں نے ملت اسلامیہ کی بیداری اور فکری آگہی میں اضافہ کی خاطر اپنی زندگی کا بیشتر حصہ اسلامی موضوعات پر تصنیف و تالیف کے کام کے لئے وقف کر رکھا تھا چنانچہ اسلامی موضوعات پر ان کی کتابوں کی ایک طویل فہرست موجود ہے۔ ان میں سے بعض کتابوں کی افادیت کو نگاہ میں رکھتے ہوئے انہیں مختلف زبانوں میں ترجمہ بھی کیا جاچکا ہے۔

تاریخ ''دعوت وعزیمت'' ان کی معرکۃ الآرا کتاب کا نام ہے جو کئی جلدوں پر مشتمل ہے۔ مولانا مرحوم نے اپنی اس کتاب کی پہلی جلد میں ''مثنوی معنوی اور اس کا اصلاحی مقام و پیغام'' نامی مفصل مقالے میں جلال الدین بلخی المعروف بہ مولانا روم کی شخصیت، زندگی کے حالات اور اسلامی خدمات پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ اپنی اس کتاب کے سلسلے میں مولانا علی میاں مرحوم فرماتے ہیں: ''اس کتاب میں ہمیں اصلاحی تجدد سے بحث نہیں کرنا ہے اور نہ ان اشخاص کا تعین کرنا ہے جو اس منصب کے اہل ہوسکتے ہیں اور جن کی واحد ذات نے دینی انقلاب برپا کردیا اور تجدید کے شرائط پورے کئے۔ یہاں ہمیں اسلام کی تیرہ سو سال کی تاریخ میں اصلاح و انقلاب حال کی کوششوں کے تسلسل کو دکھانا ہے اور ممتاز شخصیتوں اور تحریکوں کی نشاندہی کرنی ہے جنہوں نے اپنے اپنے وقت میں اپنی اپنی صلاحیتوں کے مطابق دین کے احیاء اور تجدد اور اسلام و مسلمانوں کی حفاظت کے کام میں حصہ لیا ہے اور جن کی مجموعی کوششوں سے اسلام زندہ اور محفوظ شکل میں اس وقت موجود ہے اور مسلمان اس وقت ایک ممتاز امت کی حیثیت سے نظر آتے ہیں''۔

ذیل میں مثنوی معنوی کے اصلاحی مقام و پیغام نامی مقالے کے وہ اقتباسات پیش کئے جارہے

ہیں جن کی اہمیت و افادیت سے انکار ناگزیر ہے۔

ذیل میں ان عنوانات کے تحت مثنوی کے بارے میں مباحث کا خلاصہ پیش ہے:

مولانا روم کے حالات سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے پر جوش طبیعت پائی تھی۔ عشق ان کی فطرت میں کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ ظاہری علم اور عقلیات کے توغل نے اس آگ کو دبا رکھا تھا، شمس تبریز کی آتشیں صحبت نے ان کی فطرت کو چھیڑ دیا اور تربیت و ماحول نے اس پر جو پردے ڈال دیے تھے، وہ دفعتاً اٹھ گئے اور وہ سراپا سوز وساز بن گئے:

شعلہا آخر ز ہر مویم دمید　　از رگ اندیشہ ام آتش چکید

یہی آتش سوز ان تھی جو ان کو کشاں کشاں سماع کی طرف لے جاتی تھی اور وہ اس سے قوت و غذا حاصل کرتے تھے۔ اسی سوز نے ان کے ساز کو چھیڑا اور خاموش رہنا ان کے لیے ناممکن کردیا۔ اس ساز سے جو نغمے نکلے، ان کے مجموعے کا نام مثنوی ہے۔ یہ ان کے خیالات وحالات، واردات و تاثرات اور مشاہدات وتجربات کا آئینہ ہے۔ اس میں صاحب کلام کا سوز ودرد، جوش ومستی اور ایمان و یقین بھرا ہوا ہے۔

مولانا کی علمی نشوونما تمام تر اشاعرہ کے علمی ماحول میں ہوئی تھی۔ وہ خود ایک کامیاب مدرس اور معقول عالم تھے۔ توفیق الٰہی نے جب ان کو معرفت وآگہی کے مقام تک پہنچایا، اور قال سے حال، خبر سے نظر، الفاظ سے معانی اور اصطلاحات وتعریفات کے لفظی طلسم سے ترقی کر کے حقیقت ومغز تک پہنچے تو ان کو فلسفہ وعلم کلام کی کمزوریوں اور استدلال وقیاس کی غلطیوں کا اندازہ ہوا اور فلاسفہ و متکلمین اور اہل استدلال کی بے بضاعتی اور حقیقت ناشناسی کی حقیقت ان پر منکشف ہوگئی تو انہوں نے بڑی قوت اور وضاحت کے ساتھ علم کلام پر تنقید کی، وہ چوں کہ اس کوچے کے ذرہ ذرہ سے آشنا ہیں، اس لیے وہ جو کچھ کہتے ہیں، وہ ان کا ذاتی تجربہ ومشاہدہ ہوتا ہے اور اس کی واقفیت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا۔

معتزلہ کی حواس پرستی نے ایمان بالغیب کو بہت نقصان پہنچایا تھا اور شریعت اور وحی کے پیش کیے ہوئے حقائق کی طرف سے ایک طرح کی بے اعتمادی پیدا کردی تھی۔ مولانا اس حواس پرستی اور اس کے پر جوش وکیلوں پر تنقید کرتے ہیں، مولانا نے جابجا ثابت کیا ہے۔ حواس ظاہری کے علاوہ انسان کو کچھ حواس باطنی عطا ہوئے ہیں۔ یہ حواس باطنی حواس ظاہری کے مقابلے میں کہیں زیادہ وسیع و وقیع

ہیں۔ ان کے نزدیک کسی چیز کے انکار کے لیے یہ ثبوت بالکل کافی نہیں کہ وہ دیکھنے میں نہیں آتی یا حواس اس کی تصدیق نہیں کرتے۔ ان کے نزدیک باطن ظاہر کے پیچھے نہاں اور دوا میں فائدہ کی طرح پنہاں ہے۔

مولانا حواس سے آگے بڑھ کر عقل پر بھی تنقید کرتے ہیں کہ عالم غیب کے حقائق اور انبیاء کے علوم ومعارف کے بارے میں عقل بھی کوتاہ اور نارسا ہے۔ دریائے شور کا رہنے والا آب شیرین کا کیا اندازہ کرسکتا ہے؟ وہ ایک سیدھی اور عام فہم بات کہتے ہیں کہ اگر عقل دینی حقائق ومعارف کے ادراک کے لیے کافی ہوتی تو اہل منطق واستدلال اور ائمۂ کلام سب سے بڑے عارف اور دین کے محرم اسرار ہوتے۔ اس عقل جزوی کے بجائے جو محسوسات ومعلومات اور تجربات کی پابند اور دنیا کے اندر محدود ہے۔ وہ اس عقل ایمانی کے قائل ہیں جو خود عقل کے لیے رہنما اور اسی کے لیے چراغ راہ ہے۔ عقل ایمانی شہر کے لیے پاسبان کا حکم رکھتی ہے۔ ان کے نزدیک جس طرح حواس عقل کے تابع اور محکوم ہیں، اس طرح عقل پر روح کو تفوق اور حکومت حاصل ہے۔ روح ایک اشارہ میں عقل کی سیکڑوں گرھیں کھول دیتی ہے اور چٹکیوں میں اس کی مشکل آسان کردیتی ہے۔

فلسفی دنیا کے علوم سے باخبر، بڑا وسیع النظر، صدہا چیزوں سے آشنا، مگر اپنے سے نا آشنا ہے حالانکہ سب سے بڑا علم خود شناسی ہے۔ وہ اپنے زمانے کے عالم ومتکلم کو حکمت یونانی سے حکمت ایمانی کی طرف ہجرت کی دعوت دیتے ہیں جو حقیقی علم اور حکمت ہے۔

ساتویں صدی میں علم کلام اور عقلیت کی جو سرد ہوا عالم اسلام میں مشرق سے مغرب تک چلی تھی اس کے دل کی انگیٹھیاں سرد ہوگئی تھیں۔ اگر کہیں عشق کی چنگاریاں تھیں تو راکھ کے ڈھیر کے نیچے دبی ہوئی تھیں، ورنہ ایک سرے سے دوسرے تک افسردہ دلی بلکہ مردہ دلی چھائی ہوئی تھی۔ اس سرد اور خواب آور فضا میں مولانا نے عشق کی صدا بلند کی اور اس زور سے بلند کی ایک بار عالم اسلام کے جسم میں بجلی سی کوند گئی۔ وہ فرماتے ہیں: عشق نہایت غیور وخوددار ہے، ہفت اقلیم کی سلطنت کو خاطر میں نہیں لاتا، وہ شاہوں کا شاہ اور مطلوبوں کا مطلوب ہے، عشق ایسی بیماری ہے جس سے عاشق شفا نہیں چاہتا، لیکن یہ ایسی بیماری بھی ہے کہ پھر کوئی بیماری نہیں ہوتی۔ عقل کی ہوش مندی، عشق کی حیرانی پر قربان کردینے کے قابل ہے۔ محبوب بننا ہر ایک کے بس میں نہیں، لیکن عاشق بننا ممکن ہے۔ اگر خدا نے تم کو محبوب نہیں بنایا تو تم عاشق بن کر زندگی کا لطف حاصل کرو۔ عاشق بننے میں جو مزہ اور ترقی

ہے، وہ محبوب بننے میں کہاں ۔عشق کی دولت بیدار کسی مرد ناپائیدار محبوب کے لائق نہیں۔عشق خود زندہ ہے۔ اسے ایک زندہ و پائندہ محبوب چاہئے۔ یہ عشق الٰہی ایک بحرنا پیدا کنار ہے۔ اس کی داستان ختم ہونے والی نہیں۔ زمانے کی وسعت بھی اس کے لیے تنگ اور دنیا کی عمر بھی اس کی داستان سرائی کے لیے کوتاہ ہے۔ یہ اس حسن ازل کا قصہ ہے جس کا نہ اولیٰ ہے اور نہ آخر، اس لیے یہاں خاموشی ہی بہتر اور اعتراف عجز ہی مناسب ہے۔

یہ عشق جس کی دعوت مولانا اس جوش وخروش سے دیتے ہیں، دل کی زندگی اور بیداری اور دل کی گرمی کے بغیر ممکن نہیں۔ ہر زمانے کی طرح مولانا کے زمانے میں بھی دل کی طاقتوں اور وسعتوں سے غفلت اور ناواقفیت بڑھتی جارہی تھی اور دماغ کی عظمت کا سکہ دلوں پر بیٹھتا جارہا تھا۔ دماغ روشن اور دل سرد ہوتے جارہے تھے۔ معدہ زندگی میں مرکزی مقام حاصل کرتا جارہا تھا۔ مولانا نے دل کی عظمت ووسعت کی طرف متوجہ کیا اور اس کے عجائبات وفتوحات بیان کیے اور یاد دلایا کہ انسان اپنے جسم خاکی میں کیسا سدا بہار باغ رکھتا ہے اور اس کے پہلو میں کیسی دنیا آباد ہے، جس میں ملک کے ملک گم ہوجائیں، جس کو کسی دشمن کا خطرہ اور کسی رہزن کا اندیشہ نہیں:

ایمن آباد است دل ای مردمان　　حصن محکم موضع امن و امان
گلشن خرم بہ کام دوستان　　چشمہا و گلستان در گلستان

لیکن دل کے لفظ سے دھوکہ نہ ہو۔ دل وہ نہیں جو سینے میں دھڑکتا ہے اور خواہشات نفس اور بوالہوسی کی آماجگاہ ہے۔ جو محبت کی لذت سے ناآشنا، یقین کی دولت سے محروم، ذوق وشوق سے خالی ہے، جس کی گتھی کبھی کھلتی نہیں اور جس کی قسمت کبھی چمکتی نہیں، یہ دل، دل نہیں، پتھر کی ایک سل ہے۔

یہ دل اپنی ساخت اور اپنی صورت شکل، جسامت کے لحاظ سے ویسا ہی ایک دل ہے جیسے اہل دل کا بیدار وبیتاب دل، لیکن حقیقت کے لحاظ سے دیکھئے، تو سوائے لفظی اشتراک اور جسمانی مشابہت کے دونوں میں کوئی مناسبت نہیں، وہ بھی پانی ہے جو چشمۂ صافی میں رواں ہے اور وہ بھی پانی ہے جو کسی دلدل یا کیچڑ کے اندر ہے، لیکن پہلا پانی خالص پانی ہے جس سے پیاس بجھائی جاسکتی ہے اور ہاتھ بھی صاف ہوسکتے ہیں، دوسرے پانی میں مٹی کا اتنا جز ہے کہ اس سے پانی کا کام لینا مشکل ہے، یہی فرق دل اور دل میں ہے، لیکن پھر تسلی دیتے ہیں کہ دل بہر حال دل ہے اور خدا کے یہاں کوئی

دل مردود نہیں ، وہ ہر دل کا خریدار ہے۔ اس لیے کہ خریداری سے اس کا کوئی فائدہ مقصود نہیں۔

مستبد شخصی سلطنتوں کے اثرات اور پیہم مظالم ، مسلسل جنگوں کے نتیجے میں عام انسانوں میں زندگی سے بے زاری ، اپنے مستقبل سے مایوسی اور احساس بہتری پیدا ہوگیا تھا اور انسان خود اپنی نگاہ میں ذلیل ہوگیا تھا، عجمی تصوف نے فنائیت، انکارذات اور خودشکنی کی تلقین اتنے جوش اور قوت سے کی تھی کہ خودنگری اور خود شناسی جس پر حرکت ، جدوجہد اور کشمکش موقوف ہے ، ایک اخلاقی جرم اور مانع ترقی سمجھی جانے لگی تھی۔ انسانوں کے سامنے ملکوتی صفات کے حصول اور لوازم بشریت سے انسلاخ، تجرد وتقرید کی تبلیغ اس انداز میں ہوئی تھی کہ انسان کو اپنی انسانیت سے شرم آنے لگی تھی اور وہ اپنی ترقی انسانیت میں نہیں، بلکہ ترک انسانیت میں سمجھنے لگا تھا۔ عام طور پر مقام انسانیت سے غفلت اور انسان کی رفعت وشرافت سے ذھول پیدا ہوگیا تھا اور اس وقت کی ادبیات اور شعروشاعری میں تحقیرو انسانیت کی روح سرایت کرگئی تھی۔ اس کا نفسیاتی اثر یہ تھا کہ لوگوں میں عام طور پر اپنے بارے میں بے اعتمادی ، ناامیدی، افسردگی اور شکستہ دلی پائی جاتی تھی اور انسان کبھی کبھی حیوانات اور جمادات پر رشک کرنے لگا تھا، وہ جوہر انسانیت سے ناواقف اور اپنی عظمتوں اور ترقیات سے غافل تھا۔ مولانا نے اپنے مخصوص انداز میں اس پہلو کو ابھارا اور انسان کی بلندی کا ترانہ اس جوش سے بلند کیا کہ اس کی سوئی ہوئی خودی بیدار ہوگئی اور وہ اپنے مقام پر آگاہ ہوگیا۔ مولانا کی اس جز خوانی کا پوری اسلامی ادبیات پر اثر پڑا اور اس نے شعروشاعری اور تصوف میں ایک نیا رجحان پیدا کردیا۔

مولانا انسان کو اپنی انسانی خلقت کی طرف توجہ دلاتے ہیں جس کو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں جابجا ''احسن تقویم'' کے نام سے خطاب فرمایا ہے۔ یہ لباس موزوں خاص طور پر اسی کے لیے قطع کیا گیا ہے اور اس کی قامت پر راست آتا ہے۔

وہ فرماتے ہیں کہ انسان خلاصۂ کائنات اور مجموعہ اوصاف عالم ہے۔ انسان کیا ہے، ایک کوزہ میں دریا بند ہے۔ یہ آفرینش عالم کا مقصود اور تمام کائنات کا محسود ہے۔ اسی سے عالم رنگ وبو اور زندگی کی آبرو ہے۔ اس کی طاعت تمام موجودات پر فرض ہے۔ انسان مظہر صفات الٰہی ہے۔ وہی ایک ایسا آئینہ ہے جس میں تجلیات وآیات کا عکس نظر آتا ہے۔ خلاصہ کے طور پر وہ اقرار کرتے ہیں کہ انسان کی قدرو قیمت کا بیان اب بھی مکمل نہیں اور سچ پوچھیے تو کسی میں اس کے سننے کی تاب بھی نہیں۔

گر بگویم قیمت آن ممتنع　　من بسوزم، ہم بسوزد مستمع

انسان کا سودا ہو چکا ہے، اللہ اس کا خریدار ہے اور وہی انسان کا سچا قدردان ہے۔ لیکن یہ سب ان انسانوں کا تذکرہ ہے جو جوہر انسانیت سے آراستہ اور حقیقت انسانیت سے آشنا ہیں۔ ان انسان نما آدمیوں کا ذکر نہیں جو انسانیت کا خول اور صورت ہی صورت ہیں، جو اپنے نفس کے مارے ہوئے اور خواہشات نفس کے قتیل ہیں۔ یہ آدمی نہیں، آدمی کی بے جان تصویر ہیں:

این نہ مردانند، لیکن صورت اند　　مردۂ نان اندو کشتۂ شہوت اند

ہر زمانے کی طرح مولانا کے زمانے میں بھی یہ حقیقی انسان کمیاب اور عنقا صفت تھا، عام طور پر وہی انسان ملتے تھے جو چوپایوں اور درندوں کے اخلاق رکھتے تھے۔ مولانا ان بہایم صفت اور درندہ خصلت انسانوں سے اکتا گئے تھے اور ان کو انسان کی تلاش تھی، اپنی تلاش تھی۔ اپنی تلاش کا واقعہ ایک دلچسپ مکالمے کی شکل میں بیان فرماتے ہیں:

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گرد شہر　　کز دام و در ملولم و انسانم آرزوست

زین ہمرھان سست عناصر دلم گرفت　　شیر خدا و رستم دستانم آرزوست

گفتند یافت می نشود جستہ ایم ما　　گفت: آن کہ یافت می نشود آنم آرزوست

مولانا کا تصوف اور ان کی تلقین تعطل و بے عملی اور رہبانیت کی مبلغ نہیں۔ وہ عمل، جد و جہد، کسب اور اجتماعی زندگی کے داعی اور مبلغ ہیں۔ رہبانیت اور ترک دنیا کو اسلام کی روح کے منافی اور تعلیمات نبوت کا مخالف سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک اگر اجتماعی زندگی مطلوب نہ ہوتی تو جمعہ و جماعت اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تاکید کیوں ہوتی؟

شعر کی زبان سے وہ فرماتے ہیں کہ انسانوں کو جو اعضا و جوارح اور جو صلاحیتیں اور طاقتیں دی گئی ہیں، ان سے خود ظاہر ہوتا ہے کہ اس سے کوشش وجدوجہد مطلوب ہے۔ اگر کوئی شخص اپنے غلام کے ہاتھ میں کدال یا پھاوڑا دیدے تو اس کا صاف مطلب ہے کہ اس سے وہ زمین کھودے، چٹان توڑے۔ اس کے لیے زبان سے کہنے کی کچھ ضرورت نہیں۔ اسی طرح جب ہم کو ہاتھ پاؤں اور کام کرنے کی قدرت دی گئی ہے تو اس کا مقصد یہی ہوسکتا ہے کہ ہم اپنے ہاتھ پاؤں اور جسمانی قوت سے کام لیں اور اپنے ارادے اور اختیار کو عمل میں لائیں۔ اس بنا پر سعی و عمل اور کسب وجہد عین خدا کی مرضی اور فطرت کا اشارہ ہے اور تعطل اور ترک عمل منشاے الٰہی کے خلاف اور کفران نعمت ہے صحیح توکل یہ ہے کہ کوشش میں کمی نہ کی جائے اور نتیجے کے بارے میں خدا پر بھروسہ کیا جائے، کیونکہ

کامیابی خدا کے ہاتھ میں ہے۔

مولانا شعر کی زبان سے اس حقیقت کا اظہار بھی کرتے ہیں کہ جدوجہد اور سعی وعمل سنت انبیاء اور طریق اولیاء ہے۔ پھر وہ یہ نکتہ بیان کرتے ہیں کہ مال واولاد دنیا نہیں ہے جس کی شریعت میں مذمت اور جو خدا کی رحمت سے دور ہے، وہ غفلت کی زندگی ہے۔

مولانا نے عقلیات وحسیات پر صرف تنقید اور اپنے زمانے کے علم کلام کی بے اعتدالی، ظاہر پرستی اور لفظی معرکہ آرائی پر گرفت نہیں کی اور صرف باطنی احساسات وجدان اور روح سے کام لینے اور عشق کی دعوت دینے پر اکتفا نہیں کی، بلکہ کلامی مسائل ومشکلات کو اپنے مخصوص انداز سے حل کرنے اور اپنے مخصوص پیرایے میں بیان کرنے اور دلنشیں کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ گویا مولانا کی دعوت اور ان کا فلسفہ صرف سلبی اور ناقدانہ ہی نہیں، بلکہ ایجابی اور معلمانہ بھی ہے جن مسائل کے حل کرنے میں علم کلام کے بازو شل ہوکر رہ گئے ہیں اور جن گتھیوں کے سلجھانے کی کوشش میں اور بے شمار گتھیاں پڑگئی ہیں، مولانا ان مسائل کو اس طرح بیان کرجاتے ہیں کہ گویا ان میں کوئی پیچیدگی ہی نہیں تھی اور وہ بدیہی حقائق اور روز مرہ کی باتیں اور واقعات ہیں۔ مولانا کا خاص طرز یہ ہے کہ وہ دماغ کو شکست دینے کی، مخاطب کو لاجواب کرنے کی کوشش نہیں کرتے، بلکہ اپنی بات کو اس کی خوشی اور رضا مندی سے دل میں بٹھانے اور ذہن میں اتارنے کی کوشش کرتے ہیں اور مخاطب کو یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ یہ بات پہلے سے اس کے دل میں تھی اور مولانا نے اس کی ترجمانی کی ہے۔ اس طرز کلام کا نتیجہ یہ ہے کہ مثنوی سے دینی اصول وعقاید اور متکلمانہ مسائل ومباحث کے بارے میں ایسا اذعان، شرح صدر اور اطمینان قلب پیدا ہوتا ہے جو علم کلام کے پورے کتب خانے سے نہیں پیدا ہوتا۔

وجود باری تعالیٰ کا مسئلہ علم کلام اور تمام مذاہب کا معرکۃ الآرا اور بنیادی مسئلہ ہے۔ قدیم علم کلام نے اس کے جو دلائل دیے ہیں وہ محض منطقی ہیں۔ ان سے اذعان اور یقین کی کیفیت پیدا نہیں ہوتی۔ زیادہ سے زیادہ آدمی لاجواب ہوکر رہ جاتا ہے۔ قرآن مجید کا طرز یہ ہے کہ وہ اس بارے میں انسان کی فطرت سلیم کو اکساتا ہے اور اس پر اظہار اعتماد کرکے اس کے سوئے ہوئے احساس کو بیدار کردیتا ہے۔

مولانا نے بھی مثنوی میں یہی طرز استدلال اختیار کیا ہے۔ وہ جابجا کائنات سے خالق کائنات کے وجود پر استدلال کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ دنیا میں بہت کچھ ہوتا ہوا نظر آتا ہے، لیکن کرنے

والا ان ظاہری آنکھوں سے نظر نہیں آتا، مگر جو کچھ ہو رہا ہے، یہ خود اس کی دلیل ہے کہ اس پردے کے پیچھے کوئی کرنے والا ہے، لیکن فعل ظاہر اور فاعل مخفی ہے۔

انبیاء علیہم السلام کا تعارف وہ خود ان کی زبان سے کراتے ہیں اور بتلاتے ہیں کہ وہ طبیبان الٰہی اور معالجین قلوب ہیں۔ طبیب نبض سے دل تک پہنچتے ہیں، انبیاء براہ راست دل تک پہنچ جاتے ہیں۔ طبیبوں نے صحت جسمانی کے تعاقب پر اور انبیاء نے دلوں کی شفا اور اخلاق اعمال کی اصلاح اور اعتدلال پر توجہ دی ہے۔ انبیاء کے تذکرے میں وہ فرماتے ہیں کہ وہ بڑے غیور اور خود دار ہوتے ہیں، ان سے استفادہ کے لیے ادب اور نیاز مندی شرط ہے۔ وہ سلطان مزاج و شاہ طبیعت ہیں۔ ان کا منصب یہ ہے کہ وہ فرمائیں اور دوسرے سنیں۔ معارضہ اور مجادلہ محرومی کا باعث اور حجاب اکبر ہے۔

مولانا کے نزدیک موت حقیقی زندگی کا پیش خیمہ اور انسان کی ترقی کا زینہ ہے۔ آبادی ویرانی کے بغیر ممکن نہیں۔ خزانہ تب ہی دستیاب ہوتا ہے، جب زمین کھودی جاتی ہے۔ جب بنے ہوئے مکان کو ویران کیا جا رہا ہو تو سمجھ لو کہ دوبارہ آباد کرنے کا سامان کیا جا رہا ہے۔ اس جسم خاکی کی شکست، ایک بڑی تعمیر کی علامت ہے۔ کلی کے چٹکنے سے سمجھ لینا چاہئے کہ پھل آنے والے ہیں۔ وہ جواد مطلق، وہ فیاض برحق، جان جیسی دولت دے کر کیسے بالکل چھین لے گا۔ اس لیے سمجھنا چاہئے کہ وہ زارہ نزار جان لے کر زندگی جاودان عطا فرمانا چاہتا ہے۔ وہ اس خاکدان سے نکال کر ایسی گرانقدر نعمتیں عطا فرمانا چاہتا ہے جو وہم وخیال میں بھی نہیں۔

نیستی ہی ہستی کا استحقاق پیدا کرتی ہے اور خالق کی رحمت کو جوش میں لاتی ہے۔ منعم ہمیشہ فقیروں ہی پر سخاوت کرتے ہیں۔ جبر و اختیار کی بحث علم کلام کی مشکل ترین بحثوں میں شمار ہوتی ہے۔ ایک فرقہ اختیار کا منکر اور جبر محض کا قائل ہے، اور عقائد وفرق کی تاریخ میں جبریہ کے لقب سے مشہور ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ اگر انسان مجبور محض ہوتا تو وہ خدا کی طرف سے امر ونہی کا مخاطب کیوں بنتا اور شریعت کے احکام اس کی طرف کیوں متوجہ ہوتے۔ کیا کسی نے کسی پتھر کو بھی حکم دیتے سنا ہے۔

فرماتے ہیں کہ اختیار کا عقیدہ انسان کی فطرت میں داخل ہے اور وہ روز مرہ کی زندگی میں اسی عقیدہ کا اقرار اور جبر کا انکار کرتا رہتا ہے۔ کسی پر چھت کی لکڑی جاتی ہے تو اس کو چھت پر غصہ نہیں آتا، سیلاب سامان بہالے جاتا ہے تو کسی کو اس پر غصہ اتارتے نہیں دیکھا گیا، ہوا کسی کی پگڑی اڑا لے جاتی ہے تو کوئی ہوا سے نہیں لڑا، سب جانتے ہیں کہ یہ مجبور و بے قصور ہیں۔ البتہ انسان کے

ساتھ انسان کا یہ معاملہ نہیں، گویا صرف وہی صاحب اختیار ہے۔

اسباب وعلل کے بارے میں اسلامی فرقوں میں بڑی افراط وتفریط تھی۔ مولانا کا مسلک اعتدال پر مبنی ہے۔ وہ اعتراف کرتے ہیں کہ اسباب کی ایک حیثیت ہے اور علل ومعلولات، اسباب ومسببات کا ایک سلسلہ ہے جس کا انکار نہ ممکن ہے، نہ معقول۔ عام سنۃ اللہ یہی ہے کہ مسببات اسباب کے تابع ہوں اور اشیاء سے ان کے خواص برآمد ہوں۔ البتہ خرق عادت ممکن ہے اور کبھی کبھی اس کا وقوع ہوتا ہے۔

اسی اندازہ پر مولانا ان تمام کلامی مسائل اور مذہب کے اصول وعقائد کی تشریح اور تلقین کرتے چلے جاتے ہیں جن کو متکلمین واشاعرہ کے مناظرانہ طرز استدلال اور فلاسفہ کی طلسم آرائی نے چیستان اور نہایت خشک اور محدود موضوع بحث بنادیا تھا۔ مولانا نے ان مباحث وحقائق کو علم کلام اور فلسفے کے تنگ کوچے سے نکال کر عام فہم اور عقل سلیم کے وسیع آفاق میں لے جا کر بحث کی اور دل نشین مثالوں، عام فہم نکتوں اور سادہ ومؤثر طرز بیان سے ان کو روز مرہ کی حقیقت اور زندگی کا واقعہ بنادیا۔

مثنوی نے عالم اسلام کے افکار وادبیات پر بڑا گہرا اور دیرپا اثر ڈالا۔ اسلامی ادب میں ایسی شاذ و نادر کتابیں ملیں گی جنہوں نے عالم اسلام کے اتنے وسیع حلقے کو اتنی طویل مدت تک متاثر رکھا ہے۔ چھ صدیوں کے مسلسل دنیائے اسلام کے عقلی، علمی، ادبی حلقے اس کے نغموں سے گونج رہے ہیں اور وہ دماغ کو نئی روشنی اور دلوں کو نئی حرارت بخش رہی ہے۔ اس سے ہر دور میں شاعروں کو نئے مضامین، نئی زبان، نیا اسلوب ملتا رہا اور وہ ان کے قوائے فکر اور ادبی صلاحیتوں کو ابھارتی رہی۔

اس کے مضامین یکسر تنقید سے بالاتر اور ہر قسم کی لغزش اور خطا سے مبرا نہیں۔ بہت سے فاسد العقیدہ صوفیوں اور اہل ہویٰ نے اس سے کبھی کبھی غلط فائدہ بھی اٹھایا۔ وحدت الوجود کے قائلین کو اب بھی اس سے اپنے مسلک کے لئے دلائل وشواہد مل جاتے ہیں۔

مثنوی کا ایک اہم کارنامہ یہ ہے کہ بیسویں صدی عیسوی میں جب عالم اسلام پر دوبارہ مادیت وحسیت کا حملہ ہوا۔ اور یورپ کے نئے فلسفے اور سائنس نے قلوب میں شکوک وشبہات کی تخم ریزی کی اور ایمانیات وغیبیات کی طرف سے ایک عام بے اعتمادی پیدا ہونے لگی، اس کا رجحان بڑھنے لگا کہ ہر وہ چیز جو مشاہدے اور تجربے کے ماتحت نہ آسکے اور حواس ظاہری اس کی گرفت نہ کرسکیں، وہ موجود نہیں، عقاید کی قدیم کتابوں اور قدیم طرز استدلال وعلم کلام نے اس کا مقابلہ کرنے سے معذوری

ظاہر کی تو مثنوی نے اس بڑھتے ہوئے سیلاب کا جو یورپ کی مادی اور سیاسی فتوحات سے کم خطرناک نہ تھا، کامیاب مقابلہ کیا۔ ہندستان میں ان اہل علم کی بڑی تعداد ہے جو اس حقیقت کا صاف اعتراف کرتے ہیں کہ ان کو مثنوی کی بدولت دوبارہ دولت اسلام نصیب ہوئی۔

بیسویں صدی کے سب سے بڑے مسلمان فلسفی اور مفکر (ڈاکٹر سر محمد اقبال) نے شیخ رومی کے فیض و ارشاد اور اپنے تلمذ و استرشاد کا جابجا اعتراف کیا ہے اور اس کا برملا اظہار کیا ہے کہ مثنوی نے ان کو ایک نئی روح اور ایک نیا جذبہ عطا کیا ہے۔ مثنوی اس دور انقلاب میں بھی رفیق راہ بن سکتی ہے۔ اس مادہ پرست دور کی سب سے زیادہ نایاب جنس سوز و گداز اور محبت پاک باز ہے۔ یہ دولت بیدار مثنوی سے حاصل کی جاسکتی ہے۔ عصر حاضر کے نوجوانوں کو وصیت کرتے ہوئے اقبال فرماتے ہیں:

پیر رومی را رفیق راہ ساز　　تا خدا بخشد ترا سوز و گداز
زانکہ رومی مغز را داند ز پوست　　پای او محکم فتد در کوی دوست